مبین مرزا*

... اثرِ خوابِ گراں میں

جوش — انقلاب و تہذیب کا تناظر

جوش کی شاعرانہ شناخت کے صیغوں میں ایک اہم بلکہ اہم تر صیغہ انقلاب ہے۔ انھیں یاد کرنے والے ''شاعرِ انقلاب'' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں یہ خطاب اِس طور کہ شناختی نشان بن جائے، کسی اور شاعر کے حصّے میں نہیں آیا، یہاں تک کہ اُن ترقی پسند شاعروں میں سے کسی کے حصّے میں بھی نہیں جنھوں نے ایشیا کو سرخ بنانے اور انقلابی نعرے لگانے میں اپنی زندگی اور شاعری سبھی کچھ تج دیا۔ یہ اعزاز حصّے میں آیا تو صرف جوش کے — وہی جوش جنھیں حسن سے بھی لگاؤ تھا جنھیں زندگی بھی عزیز تھی۔

جوش کے ایسے مداحوں کی تعداد خاصی ہے جن کے تئیں جوش کا اگر سارا نہیں تو بہرحال سب سے بڑا کریڈٹ اُن کی شاعری میں انقلابی فکر اور باغیانہ لہجے کا اظہار ہے۔ اس حوالے سے جو کچھ پڑھنے اور پھر جوش کی شاعری پر غور کرنے کا موقع ملا، اُس سے میرے افسوس میں اضافہ ہوتا رہا۔ یار لوگ شعر و ادب کو سراہتے ہوئے بھی کچھ وہی انداز اختیار کرتے ہیں جو لکی ایرانی سرکس میں رسّے پر سائیکل چلاتے ہوئے آدمی یا شیر پر سواری کرنے والی نازک اندام حسینہ کے کرتب کو دیکھ کر اختیار کرتے ہیں۔ اصل میں اس رویّے کے پیچھے جو سوچ کام کرتی ہے وہ یہ ہے کہ سرکس کے بعد بھی بلکہ ساری عمر وہ آدمی رسّے پر سائیکل ہی چلاتا رہتا ہے اور وہ حسینہ بھی ساری

عمر شیر کی پشت پر اسی طرح سوار رہتی ہے۔ گویا ان کی زندگی میں کرنے کا کام تو بس یہی ہے۔ کسی نرے مشاعرے باز شاعر کے بارے میں بھی ایسا سوچنا سخت ناسمجھی کی بات ہے، چہ جائے کہ جوش جیسا شاعر کہ جس نے رومان پروری اور فطرت پسندی سے معقولات و منقولات اور حیات و کائنات والٰہیات تک محیط موضوعات کو متنوع پہلوؤں اور متعدد زاویوں سے دیکھنے، سمجھنے اور بیان کرنے کی جستجو کی ہو —— ایسے شاعر کے ساتھ تو یہ صریحاً ناانصافی ہے کہ اُس کے ایک جز و کو کل باور کر کے اُسی کی بنیاد پر اس کے مقام و مرتبے کا تعین کیا جائے۔ جوش کو شاعرِ انقلاب ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن وہ صرف شاعرِ انقلاب نہیں تھے اور دوسری بات یہ کہ اُن کی انقلابیت بھی فی الاصل محض وہ نعرہ زن انقلاب پسندی نہیں ہے جو اُسے عرفِ عام میں سمجھا جاتا ہے —— اور ہمیں یہ سب باتیں اور کوئی نہیں خود جوش کا کلام بتاتا ہے اور سب سے بڑھ کر اُن کے کلام کا بھی وہی حصہ جو انقلاب آفریں نظر آتا ہے۔

سب سے پہلے تو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انقلاب، خواہ وہ کتنی ہی ارفع اور قیمتی شے کیوں نہ ہو، یہ بہر حال طے ہے کہ زندگی کو اُس پر تقدم حاصل ہے۔ یعنی انقلاب زندگی کے محیطِ آب کی ایک موج ہے، موجِ بے کراں کہہ لیجیے۔ یہ موج اپنی تندی و تیزی کے زیرِ اثر زندگی کے دریا کا مزاج تو بے شک کچھ وقت کے لیے بدل سکتی ہے لیکن اس کا وجود اور پھر اس وجود کے تمام تر معانی بھی بہر طور اس دریا ہی سے مشروط ہیں۔ ترقی پسند انقلابی اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہوں یا نہیں، جوش یقیناً رکھتے تھے، بلکہ میں تو کہوں گا کہ جوش کا تصورِ انقلاب حقیقت کے اسی شعور کا زائیدہ ہے۔ اُن کی انقلابیت کی ابتدا میں تو بے شک ایسا نہیں تھا لیکن آگے چل کر جوش کے یہاں جب اس احساس کی باضابطہ صورت مرتب ہوئی تو اس کی بنیاد ان حقائق کی آگہی پر قائم ہوئی جو انقلاب کو زندگی کی کلیت سے مربوط رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انقلاب کا سارا عمل جوش کے یہاں محض زندگی کے تحرک و تبدل ہی سے عبارت نہیں بلکہ اِس کی معنویت کی تشکیل میں انسانی زندگی کے تسلسل اور تہذیب کے شعور دونوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دیکھا جائے تو یہی وہ رُخ ہے جو جوش کے تصوّرِ انقلاب کو محض نعرے بازی نہیں ہونے دیتا بلکہ اُسے ایک فکری جہت عطا کرتا اور مطالبۂ حیات بناتا ہے۔

اب یہ زندگی کا تسلسل کیا شے ہے اور انقلاب کا اس سے رشتہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل ہمیں جوش کے تصورِ انقلاب کو ذرا کھول کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایک شعری نابغہ اپنے عصر اور اُس کے سیاسی و سماجی عناصر اور تاریخی عوامل سے کس طور اثر پذیر ہوتا ہے اور اُس کے فکر و فن پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اِس نوع کے مطالعات ہماری تنقید کے ضمنی حوالوں میں تو نظر آتے ہیں لیکن اس انداز سے تخلیق کاروں کے مبسوط مطالعے نہیں کیے گئے ہیں۔ جوش کی شاعری، اُس کا لحن، موضوعات کا دائرہ یہاں تک کہ اصناف کا بدلتا ہوا سانچا بھی اگر دیکھا جائے تو وہ اس قسم کے مطالعے کے لیے من حیث الکل ایک نہایت عمدہ case study ثابت ہوگی۔ ایک ایسی case study جس میں پورے ایک عہد کی تہذیب و معاشرت کے تغیرات اور ان کے زیرِ اثر تشکیلِ نو پاتے ہوئے انسانی احساسات کی وہ گونج سنی جا سکتی ہے جو کسی gazetteer میں ریکارڈ ہوتی ہے اور نہ ہی کسی روزنامچہ نویس یا مؤرّخ کے بیان میں۔ اس لیے کہ اس گونج کو سہارنے کی سکت صرف اور صرف ادب اور بالخصوص شعر و سخن میں ہوا کرتی ہے۔ جوش اُردو شاعری کے ایوانِ بالا و زیریں میں گونجتی ہوئی ایسی ہی ایک آواز ہے جو اپنے زمانے اور اُس کے انسانی تجربے کو حیاتِ نو کی آرزو اور ولولے سے بہ یک وقت معمور لہجے میں محفوظ کرتی دکھائی دیتی ہے۔

جوش نے اپنے انقلاب آفریں جذبات کی ترکیب میں اپنے عہد کے کن حالات و واقعات سے اثر قبول کیا ہے، اِس ضمن میں بیسویں صدی کے ہنگامہ خیز اور انقلاب بردوش حالات، عالمی جنگیں، استعمار اور سامراج کی بدلتی ہوئی شکلیں، استحصال کے نئے ہتھکنڈے، برِصغیر کے منظرنامے میں رونما ہوتی ہوئی سیاسی و سماجی تبدیلیاں، معاشی مساوات کا سوال اور ایسے ہی کتنے پہلوؤں کا حوالہ تو ہمارے یہاں بار بار دُہرایا جا چکا ہے کہ ان سب چیزوں کے زیرِ اثر جوش انقلابی شاعر بن گئے۔ بے شک یہ سب حوالے اپنی جگہ ایک حد تک درست بھی ہیں لیکن یہاں ایک جملۂ معترضہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہی سب عناصر و عوامل کسی شاعر کو انقلابی بناتے ہیں تو آخر جوش اکیلے ہی کیوں انقلابی شاعر بنے، اور کچھ لوگ کیوں نہیں بن گئے، خصوصاً اُس

کھیپ کے شعرا جو لفظی پھریروں سے سرخ جھنڈے لہراتے اور آنچل کو جھنڈا بنانے کے آوازے بلند کرتے تھے۔ سو بس یہی سوال ہے جو جوش کے تصوّرِ انقلاب کی تہ تک پہنچنے میں ہماری کفالت کر سکتا ہے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ کندن تو صرف سونا ہی بن سکتا ہے، تانبے کو کندن نہیں بنایا جا سکتا۔ یعنی خارجی حالات و اسباب کے اثر سے تو انکار نہیں کیا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بے حد اہم سوال یہ ہے کہ کسی تخلیق کار کا فطری داعیہ کیا ہے اور اس کے تحت وہ کسی شے کا اثر کس طرح قبول کرتا ہے؟ عزیز حامد مدنی کے بقول ہر شاعر کے کلام کو پرکھنے کا بنیادی اصول زندگی کے متعلق اس کا رویّہ ہوتا ہے، کیوں کہ اسی رویّے کی بنیاد پر اس کے کلام کے فکری و فنی اور ارتقائی مراحل کا دار و مدار ہوتا ہے۔ (۱) تو واقعہ یہ ہے کہ جوش کے تصوّرِ انقلاب کی تشکیل میں معروضی حالات اور خارجی عوامل بھی بے شک کارفرما رہے ہیں لیکن بایں ہمہ جوش کی انقلابیت جس مرکزے سے قوتِ نمو حاصل کرتی ہے، وہ ہے اُن کا تصورِ انسان۔

جوش کی شاعری میں اُن کا تصوّرِ انسان بادی النظر میں اک مجرّد تصوّر یا اک خود مکتفی اصول کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مثالی انسان کا یہ تصور ایک ایسے اصول کے طور پر ابھرتا ہے جو اپنے فکر و عمل سے حیات و کائنات کے دائروں کو جوڑتا اور ان میں زندگی کی سرگرمیوں اور ان کے معانی کا تعین کرتا ہے۔ تاہم امرِ واقعہ یہ ہے کہ جوش کا تصوّرِ انسان فی الاصل مجرد نہیں ہے۔ ہم اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آغاز میں مجرد نظر آنے والا مثالی انسان کا یہ تصوّر آگے چل کر مثالی نہیں رہ پاتا بلکہ جوش کی افتادِ طبع اسے حقیقی انسان کی سطح پر لے آتی ہے۔ اور پھر یہ تصور مجرّد نہیں رہتا۔ یہاں انسان کی تقدیر اور بشری محدودات سامنے آتے ہیں تب خواہی نخواہی ماننا پڑتا ہے کہ یہ تصوّرِ خدا سے مربوط اور منضبط ہے، بلکہ تصوّرِ خدا ہی جوش کی شاعری کا بنیادی مسئلہ اور مرکزی موضوع ہے (۲) کیونکہ جوش کی انقلاب پسندی ان کے تصورِ انسان سے ماخوذ ہے لہٰذا ہمیں اس مسئلے کو اسی سیاق و سباق میں دیکھنا چاہیے۔

جس طرح جوش کا تصوّرِ انسان مثالی آدمی سے نزول کرتے ہوئے حقیقی آدمی تک پہنچتا ہے کچھ اُسی طرح ان کی انقلاب پسندی بھی اوّل اوّل جوش و خروش اور بغاوت و سرکشی سے گزر کر

کہیں اور جا پہنچتی ہے۔ کہاں جا پہنچتی ہے، اس پر ہم بات کریں گے کچھ آگے۔ خیر، تو جہاں وہ پہنچتی ہے اس مقام پر ان کے یہاں انقلاب کے جو معانی ترتیب پاتے ہیں وہ آغاز کے انقلابی تصورات و رُجحانات سے بہت حد تک بدل جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اس درجہ اہم اور جوہری نوعیت کی ہے کہ خود ترقی پسند انقلابی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں یہ اعتراض اٹھتا ہے کہ جوش کی انقلابیت کے پردے میں ان کی انانیت اور انفرادیت کا غلغلہ بلند ہوتا ہے اور یہ کہ ان کی انقلابی تگ و دو کا مظہر کوئی طبقہ نہیں بلکہ فرد ہوتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ سوال ہمیشہ کا اٹھایا ہوا نہیں ہے بلکہ ایک سنجیدہ شعری شعور رکھنے والے ذہن نے یہ نکتہ تراشا ہے۔ سوچیے کون؟ کوئی اور نہیں اپنے فیض صاحب۔ لہٰذا ہم نے دیکھا کہ نظریہ پسندی ادب و نقد کے حق میں کس طرح زہرِ ہلاہل کا کام کرتی ہے۔ یہ نظریے کی جبریت ہی کا اثر ہے کہ طبقاتی پہلو اُس سوال میں بھی در آئے جہاں اس کی ضرورت تک نہیں ہے۔ جوش کی انقلابیت پر ایک اور بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس میں رومانیت پائی جاتی ہے اور اسی بنیاد پر کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ جوش شاعرِ انقلاب نہیں بلکہ شاعرِ شباب اور شاعرِ شراب تھے۔ یہ گل افشانیِ گفتار بھی غیروں کی طرف سے نہیں اپنوں ہی کی جانب سے ہوئی تھی۔ بعد ازاں علی سردار جعفری ایسے دو چار لوگوں نے اس اعتراض کو رد کرنے کی کوشش بھی کی لیکن منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات کے مصداق ایسی باتیں ہوا کی مانند پھیلتی اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

اب اگر دیکھا جائے تو اس قبیل کے اعتراضات میں سارا قصور یار لوگوں کا بھی نہیں تھا۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

کام ہے میرا تغیّر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اُکسائے میرا شعر اگر جذبہ ہائے جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاجِ سنگ

خرمن میں میرا شعر اگر کج کرے کلاہ
خس تند بجلیوں سے لڑانے لگے نگاہ
آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب
پیری کی ہڈیوں میں مچلنے لگے شباب
تجھ کو یقیں نہ آئے گا اے دائمی غلام
میں جاکے مقبروں میں سناؤں اگر کلام
خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں

یہ لہجہ، یہ طنطنہ، یہ آہنگ، یہ خیال اور یہ رویّہ بھلا اِن سب کے زیرِ اثر اِکہرے فکر و خیال کا آدمی بہکے گا نہیں تو کیا کرے گا۔ ان مصرعوں کی قوت اور بہاؤ کی تاب لانا کسی محدود فکر اور مسدود نظر آدمی کے بس کی بات بھلا کب ہوگی۔ سو جو کچھ جوش صاحب کو کہا گیا، جو اعتراضات اور سوالات ان کی انقلاب پسندی کی بابت اٹھائے گئے، ان کی ذمہ داری ایک حد تک تو خود جوش پر بھی عائد ہوتی ہے۔ سو بے چارے ترقی پسندوں کا کیا دوش اگر وہ جوش کے ایسے مصرعوں کی تاب نہیں لا پاتے اور ان سے آگے بڑھ کر اُن کے اصل تصورِ انقلاب تک پہنچنے کی بجائے انھیں مصرعوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ بھلا قصۂ لیلیٰ سنتے ہوئے قیس، مجنوں نہ بنے تو کیا ارسطو بن کر دکھائے۔

اب یہ تو ہوا بات کا ایک رُخ۔ تاہم جب ہم دوسرے رُخ سے جوش کے انقلابی اشعار پر غور کرتے ہیں تو بات کی نوعیت اور معنویت دونوں ہی بدل جاتی ہیں اور ایک مختلف تناظر سامنے آتا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ جوش کے یہاں جذبے کی شدت اور رومانی کیفیت نہ ہوتی تو اُن کی انقلاب پسندی کھوکھلے نعرے کی سطح سے اوپر اٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اصل میں جذبہ اور رومان دونوں وہ خالص عناصر ہیں جو جوش کے تمام بنیادی تصوّرات — تصورِ خدا، تصورِ انسان، تصورِ حیات، تصورِ ذات اور تصورِ عشق وغیرہ کی تشکیل، تعمیر اور ترفّع کے مراحل میں کیمیا کا سا کردار ادا کرتے

ہیں۔ مجھے تو یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ جذبہ اور رومان جوش کے فکری موضوعات ہی نہیں فنی لوازمات اور لہجہ و آہنگ کے امتیازات تک کو قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً دیکھیے:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

سنتے ہیں کہ ہے یہ روزگارِ سفّاک
ایک صاحبِ رحمت و کرم کی ایجاد
اگر چاہوں تو دُنیا کو ہلادوں
زمیں کیا آسمانوں کو نچادوں
فلک کیا عرش کو بھی پست کردوں
خودی کیسی خدا کو مست کردوں

نور میرا وقت کے قدموں کے نیچے ہے دونیم
مدتوں سے اب تک اپنی تیرگی میں ہوں مقیم

عشق کی جانب جو مائل کچھ طبیعت ہوگئی
دل پہ غصّہ آگیا اپنے سے نفرت ہوگئی

یہ مصرعے جوش کے فکر و فن کی بابت اور سب کچھ ہمیں بعد میں بتاتے ہیں، شاعر کے یہاں جذبے کی شدت اور اُس کے رویّے کی رومانی کیفیت کا سراغ سب سے پہلے دیتے ہیں۔

اب آیئے اس بات کی طرف جو ہم نے مضمون کی تمہیدی سطور میں جوش کے شاعرانہ ذہن کی ساخت کے بارے میں کسی قدر روا روی میں کہہ ڈالی تھی کہ ایک شعری نابغہ اپنے عصر اور اس کے

سیاسی وسماجی عناصر اور تاریخی عوامل سے کس طور اثر پذیر ہوتا ہے اس حوالے سے جوش کی شاعری ایک اچھی case study ثابت ہوسکتی ہے۔ اس بات کی صراحت کے لیے ہمیں کچھ بہت زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ یہ کام جوش کو انقلابی شاعر ماننے اور ثابت کرنے والے لوگ پہلے ہی بڑے اہتمام سے کر چکے ہیں۔ ہم یہاں محض اشاروں سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیاں، مشرقی علوم اور مغربی افکار سے آگہی رکھنے والا جواں سال، مضطرب ذہن اور حساس دل شاعر، عالمی جنگ کی ہول ناک تباہ کاریوں کا مشاہدہ، بدلتی ہوئی تاریخ، بگڑتا ہوا جغرافیہ، بہروپ بھرتے سامراجی ہتھکنڈے، محکومی کا تجربہ، جبر واستحصال کی صورتوں سے واسطہ، مذہب، رنگ، نسل، قوم، قبیلہ، زبان کی بنیاد پر فرقہ واریت اور آویزش کا مشاہدہ — اور ان سب کے ساتھ معاشرے میں بڑھتا ہوا محکومی کے تحت تذلیل کا احساس، خارجی سطح پر نمایاں نہ سہی مگر داخلی دنیا کو تہ و بالا کر ڈالنے والی بے چینی، اضطراب، کش مکش جو آزادی کے بیج کو نمو دیتی ہو۔ سو جب یہ بیج پھوٹتا اور پیڑ بنتا ہے تو اس کی شاخ شاخ پر آتشیں پھول کھلتے ہیں۔ یہاں جذبے کی شدت اور رومانی کیفیت شامل ہو کر آواز کا رنگ گہرا کرتے اور اُسے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

اے ہند کے ذلیل غلامانِ رُوسیاہ

اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہر یاری کی

پاؤں میں تا چند زنجیرِ غلامی کی خراش
صرف اک جنبش ابھی ہوتی ہیں کڑیاں پاش پاش

بیدار ہے پھر فتنۂ چنگیز جہاں میں

اور تو ہے ابھی تک اثرِ خوابِ گراں میں
صیاد کمینوں میں ہیں ناوک ہے کماں میں
پیشانیِ دوراں پہ ہیں شب خون کے آثار
بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار
بیدار ہو بیدار

جذبہ و خیال کی دُنیا کو اُلٹتا پلٹتا لہجہ، دل پر خراش ڈالتا لحن، رگوں میں بجلیاں بھرتی پکار، حمیت جگاتی ہوئی آواز — یہی انقلابی جوش کی نمود ہے۔ اُن کے نو دمیدہ شعور و احساس کا شہود ہے۔ اظہارِ ہستی ہے، اثباتِ وجود ہے — لیکن، اور یہ لیکن توجہ طلب ہے، اگر جوش کی شاعری کا سارا کارنامہ یہی ہے (جیسا کہ اُن کے سادہ لوح انقلاب پسند مداح کہتے ہیں) تو پھر جوش کی انفرادیت کیا ہوئی؟ شناخت کا یہ حوالہ اس دور کے کچھ اور فن کاروں کے لیے بھی اسی طرح یا معمولی سے ردّ و بدل کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر سوال کیا جائے گا کہ وہ جو تاریخ کی زمین کا رزق ہو گئے، کیوں کھو گئے۔ وہ کیوں فراموش کاری کے صحراؤں کی ریت اوڑھ کر سو گئے؟ اور یہ جو آواز ہے، جوش کی آواز، یہ کیوں جاگتی ہے؟ یہ جاگتی اور جگاتی ہوئی آواز خواب ہے یا واہمہ ہے، کیا ہے؟

آیئے اب اُس سوال کی جانب لوٹتے ہیں جو گفتگو کے آغاز میں قائم کیا گیا تھا اور یہ کہہ کر اُسے تھام لیا گیا تھا کہ پہلے ذرا جوش کے تصوّرِ انقلاب کو سمجھ لینا چاہیے۔ گویا ہم سمجھ رہے ہیں کہ اب ہم نے جوش کے تصوّرِ انقلاب کو سمجھ لیا ہے۔ سطورِ گذشتہ میں جوش کی انقلاب پسندی کے زُمرے میں جو کچھ کہا گیا ہے، ممکن ہے کہ یہ سب باتیں قدرے اعتدال، نرمی اور غیر جذباتی انداز میں کہی گئی ہوں۔ تاہم یہ بات کہنے والا بھی جانتا ہے اور پڑھنے والے بھی کہ یہ سب باتیں پرانی ہیں، اور کم و بیش یہ ساری ہی باتیں موافقین و مخالفین کے اپنے اپنے رنگ میں کسی نہ کسی طور پہلے بھی کہی جا چکی ہیں۔ ان میں اوّل تو کوئی اضافہ نہیں ہے اور اگر کچھ ہے بھی سہی تو بہت معمولی

سا، محض سرسری نوعیت کا۔ اب اگر ہم اس سچائی کا اعتراف کر رہے ہیں تو اس کا سیدھا اور صاف مطلب یہ ہے کہ جوش کے تصوّرِ انقلاب کو ہم نے کماحقہٗ ابھی نہیں سمجھا — اور ہم سمجھ بھی نہیں سکتے تاوقتے کہ ہم اپنے اس سوال پر غور نہ کریں کہ یہ زندگی کا تسلسل کیا شے ہے اور انقلاب (جوش کے تصوّرِ انقلاب) سے اس کا کیا رشتہ ہے؟

ابتداً جوش کے یہاں، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، انقلاب کا تصوّر، سامراجی اور استحصالی قوتوں کے خلاف بغاوت کے اعلان، غصّے کے اظہار اور نجات یا آزادی کے مطالبے اور تبدیلی کی خواہش سے عبارت تھا — اور بس۔ بغاوت، کامیاب بغاوت کے بعد کیا؟ غصّے کے اظہار کا حاصل کیا؟ غلامی سے نجات اور حصولِ آزادی کے بعد کیا؟ شاعر کا اُمنگوں سے شرابور دل اور ولولوں سے معمور ذہن دونوں اس نوع کے سوالوں سے انقلابیت کے آغاز میں کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کی بابت شاید انھوں نے سوچا تک نہ تھا۔ لیکن تابکے! جوش ایسے معمولی دل و دماغ کے شاعر تو نہ تھے کہ ان سوالوں کی جانب ان کا دھیان ہی نہ جاتا اور ان پر انھیں سوچنا ہی نہ پڑتا۔

تعقل پسند ذہن خواہ کیسے ہی منہ زور جذبے کے زیرِ اثر آجائے، یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے اصل مقام اور اصل حالت کی طرف لوٹ کر نہ جائے۔ جوش کا شاعرانہ وفور لاکھ قابلِ رشک سہی لیکن وہ معقولیت سے عاری رہنے پر آمادہ ہو جائے، یہ بھلا کیوں کر ممکن ہے۔ اُن کی تو ذہنی تربیت ہی علومِ متداولہ سے روشناسی اور افکارِ جدیدہ سے آگہی کے سامان کے ساتھ ہوئی تھی۔ انھیں تو آنکھیں کھول کر دیکھنا اور خیالات کی کشاکش سے گزرنا ہی تھا۔ چناں چہ جوش کا وہ رومانی انقلاب پسند اپنے اندر کے سوالوں سے اُلجھا اور اُلجھتا ہی چلا گیا۔ آخر الجھی ہوئی گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں۔ جذبات کی دُھند چھٹتی ہے تو اصل منظر رونما ہوتا ہے اور اصل بات سمجھ آنے لگتی ہے۔ اب احساس کی رَو بدلتی ہے تو زبان ہی نہیں لہجہ بھی بدل جاتا ہے۔ موضوع بے شک پرانا ہے لیکن دیکھنے کا زاویہ بدلا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بات کی نوعیت اور مقصد دونوں ہی بدل گئے ہیں۔ یہ تبدیلی کب آتی ہے؟ اُس وقت جب محض بات کو بیان کرنا یا جذبے کو اظہار کا پیرایہ دینا مقصود نہ

ہو بلکہ اس کے بعد نتائج کو پانے کی تمنا بھی ہو۔ نتائج کو پانے کی تمنا کب ہوتی ہے؟ اُس وقت جب نصب العین حقیقت پسندانہ شعور کے ساتھ بالکل واضح ہو۔ جب منزل سے آگہی ہو۔ جوش کے تصوّرِ انقلاب کے پس منظر میں اُن کا تصوّرِ انسان کارفرما ہے۔ یہ تصوّر بھی آغاز میں مغرب کی مثالیت پسندی کے زیرِ اثر تھا اور ایک ایسے انسان کو پیش کرتا تھا جس کے اوصاف غیر انسانی حد تک مثالی تھے۔(۳) لہٰذا اس کے نہ تو کوئی محدودات تھے اور نہ ہی اس کے لیے جبر و قدر کا مسئلہ کوئی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس جہانِ عنصری میں گوشت پوست کا آدمی ان معیارات پر پورا نہیں اُتر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں تین امکانات کا محل تھا۔

(۱) ایک یہ ہے کہ جوش اس فانی اور کم زور انسان اور اس کے علائق سے مایوس ہو کر انسان اور اس کی زندگی میں انقلاب کے امکان دونوں پر لعنت بھیج کر کسی اور طرف متوجہ ہو جاتے، (۲) دوسرے یہ ہو سکتا تھا کہ وہ حقائق سے آنکھیں چراتے اور مایوسی سے بچنے کے لیے مثالی انسان کے گن گاتے اور انقلاب کے بعد کی مثالی دُنیا کے خواب دیکھنے اور دکھانے میں مصروف رہتے، (۳) تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ جوش حقائق کا ادراک کرتے ہوئے اپنی تاریخ و تہذیب سے اعلیٰ انسانی اوصاف کی مثال حاصل کرتے اور اپنے عہد کے انسانی معاشرے کے لیے اُس کی جستجو اور تگ و دو کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے تصوّرِ انقلاب کو نیا تناظر فراہم کرتے۔ ان میں سے کسی بھی امکان کو اختیار کرنے کا انحصار اس امر پر تھا کہ جوش کی فکری بنیادیں تہذیب کی کس زمین پر اُستوار ہیں۔

اب یہ وہ مقام ہے جس پر ہمیں اک ذرا تحمّل کے ساتھ غور کرنا ہوگا۔ یہ نکتہ کوئی بہت دقیق یا باریک نہیں ہے لیکن اہم بہرحال ہے۔ اس لیے کہ اس طرح کے پہلو پر بات کرتے ہوئے ہمارے تنقیدی معتقدات پر ضرب پڑتی ہے۔ جوش کے سلسلے میں جن باتوں کا ہمارے یہاں بڑا شہرہ ہوا ان میں سے ایک اُن کی دہریت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش نے جن تصوّرات پر بار بار غور کیا اور جن کی بابت مسلسل سوالات قائم کیے، ان میں سب سے اہم مذہب ہے — اور یہاں مذہب سے مراد ہے ایمانیات کا مکمل دائرہ جو وجودِ باری سے لے کر تدبیر و عمل اور تقدیرِ

انسانی تک کو محیط ہے۔ جوش نے اس دائرے کے ایک ایک موضوع پر غور کیا اور سوالات قائم کیے۔ ان سوالات کے پس منظر میں ان کے منطقی ذہن پر مغربی افکار و نظریات کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس عہد کے ذہنی رویّوں اور عقلی رُجحانات کو بھی ایک حد تک دخل ضرور رہا ہے۔ تاہم اگر جوش کا مطالعہ جامع تناظر میں بہ نگاہِ غائر کیا جائے تو اِس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ دہریت جوش کی منزل نہیں تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے کہ جو ذہن حقائق کا جویا ہو اور منطق کی کسوٹی کے ناقص ہونے کا راز جس پر افشا ہو چکا ہو، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ بڑے حقائق تک رسائی اور ان کے ادراک کے عمل میں اعتراف کی منزل سے گریزاں رہے۔

کسی تخلیق کار کا مطالعہ اگر اُس کے فن کی داخلی شہادتوں کی روشنی میں کیا جائے اور اپنے تعصبات کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو نتائج اخذ کرنے میں بد دیانتی اور distortion سے بچا جاسکتا ہے۔ قبولِ حق کا مسئلہ جب جوش کے یہاں حل ہوتا ہے تو اعتبار اور اثبات کے سارے حوالے ایک زندہ تجربے میں ڈھل جاتے ہیں۔ تب اُن کے یہاں وہ آواز پیدا ہوتی ہے جو اپنی تہذیب و تاریخ کے تابندہ لمحوں کو relive کرتی ہے۔ یہ عمل اُن کے یہاں کہیں تطبیق کی صورت اور کہیں موازنے کے طور پر رونما ہوتا ہے۔

تطبیق کا حوالہ بعد میں آئے گا، پہلے موازنے کا رنگ دیکھیے ان کے یہاں کیا ہے:

لیلیِ آفاق اُلٹتی ہی رہی پیہم نقاب
اور یہاں عورت، مناظر، عشق، صہبا، انقلاب
دائمی قدروں کی ہر ساعت گہر پاشی رہی
اور یہاں وقتی مسائل ہی کی عیّاشی رہی
غرفہ ہائے لعل و گوہر آسماں کھولا کیا
اور میں رندِ سیہ رُو کوئلے تولا کیا

یہاں اپنی ذات ہدفِ ملامت ہے کہ وقت، تاریخ، زمانہ، تہذیب (ہم اُسے جو نام دینا چاہیں) کیسے کیسے حقائق کا حامل اور عقدہ کشا ہے اور میں ان سے لاتعلق اپنی ذات کے کنویں میں بند ہوں۔ اب یہ میں کون ہے؟ صرف شاعر؟ نہیں یہ کوئی فرد نہیں بلکہ prototype ہے، اس انسان کا prototype ہے جس کو قرآن کریم کی زبان میں ظلوماً جہولا کہا گیا ہے۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ کیا ادراک کی اِس منزل تک آدمی محض اپنے منطقی رویّے اور ذاتی احتساب کے ذریعے پہنچ سکتا ہے؟ اگر پہنچ سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ یہ سارا بیان محض اپنی چارج شیٹ مرتب کرنے کا عمل ہے، یعنی صفائی اور سادگی کے ساتھ اعترافِ جرم اور سچے انکسار کے ساتھ بیانِ حلفی درج کرانے کا مرحلہ ہے۔ سلیم احمد نے اپنے ایک مضمون میں اسے انکسار یا اعتراف ماننے کی بجائے شعور کی بلندی کہا ہے،[۴] اور بالکل درست کہا ہے۔ شعور کی بلندی کے اس سفر میں شاعر محض ایک فرد نہیں رہتا، ایک تہذیب کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ اس تہذیب کا نمائندہ جو دائمی اقدار پر اصرار کرتی ہے اور ایک ایسے اخلاقی ضابطے کی حامل ہے جو مذہبی اقدار سے مرتب ہوتا ہے۔ اس تہذیب میں صغریٰ کبریٰ نہ صرف طے ہیں بلکہ ان کا تصور بھی کسی طرح کے ابہام کے بغیر پایا جاتا ہے۔

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ جوش کے یہاں احتسابِ ذات کا عمل جب بھی ہوتا ہے، اس کے پس منظر میں ہند اسلامی تہذیب کی اخلاقی و سماجی اقدار کی گونج صاف سنی جاسکتی ہے۔ وہی ہند اسلامی تہذیب جو وسیع المشربی اور انسان دوستی کو اپنا شعار بناتی ہے، بھانت بھانت کی بولیوں میں وہ لے ڈھونڈتی ہے جو انسانی احساس کو جوڑنے والے سُروں سے بنتی ہے، متضاد رنگوں سے تجربے کی مشارکت پیدا کرلیتی ہے اور عجز و انکسار کی بے ساکھیوں کے بغیر فرد کو اپنے فکر و احساس میں رُونما ہوتی تبدیلیوں کے رُوبہ رُو کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ عزیز حامد مدنی نے جوش کی شاعری کی بابت یہ جو کہا کہ جوش نے جلالِ شیخ و شکوہِ برہمنی دونوں سے جو انکار کیا تو یہ بھی اندر سے اپنی تہذیب کی معرفت اور اس کی خدا آگاہی اور خود آگاہی کو سمجھے بغیر ممکن نہیں تھا،[۵] یہ بڑا غور طلب نکتہ ہے جو ہم سے جوش کے کلام کے از سرِ مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ ہم اُس کے فکری تناظرات کو درست طور پر قائم کرسکیں۔

جوش کی انقلاب پرستی کا تو یار لوگ بڑا ڈھول پیٹتے ہیں لیکن یہ انقلاب پرستی آگے چل کر اپنی مکمل اور مرتب شکل میں جوش کے یہاں کیا خدوخال اختیار کرتی ہے اور اُن کے پورے فکری و شعری سرمائے میں اس کی قدر و قیمت کس طرح متعین ہوتی ہے، اس پر غور نہیں کرتے۔ اصل میں دونوں باتیں ہیں۔ سہل انگاری اور اکہرے پن نے تو ہمارے نقادوں کا برا کیا ہی تھا لیکن تہذیب و روایت سے ان کے للّہی بغض نے تو انھیں بالکل ہی کوڑا بنا دیا۔ ہر شے کو محض ذات میں محصور کرنے کا چلن اور تہذیبی و روایتی اثرات کے تسلسل کا انکار فیشن تو بے شک بن گیا لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ انفرادی تجربہ اور احساس ہی سب کچھ ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ جو موج اٹھتی ہے، ساحل پر پایاب ہو کر رہ جاتی ہے، اس لیے کہ سمندر سے کٹ جاتی ہے۔ جب ہم جوش کے تصوّرِ انقلاب کو کھولتے ہیں تو اس میں ہمیں تہذیبی عناصر نظر آتے ہیں اور یہ عناصر، جیسا کہ پہلے کہا گیا، اخلاقی اور مذہبی اقدار سے مملو ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جوش کی انقلاب پرستی سڑک کے بیچ جلوس لے کر چلتے لڑکوں کی ہلڑ بازی نہیں ہے بلکہ مستحکم بنیادوں پر قائم اپنی تاریخ و تہذیب کے شعور سے بہرہ مند ذہن کی وہ سنجیدہ سرگرمی ہے جو اقدارِ حیات کا تعین اسی شعور کی بنیاد پر کرتی ہے۔ وہ ماضی کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کے اثبات کے ساتھ اور اس کے تجربات کی روشنی آنے والے زمانوں اور جہانوں کی صورت گری کرنے کی خواہاں ہے۔ یہاں زندگی اپنے تسلسل میں نظر آتی ہے اور انقلاب اس تسلسل کا انقطاع نہیں کرتا بلکہ زندگی کے نئے رُخ کے تعین کا اشارہ بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جوش کے یہاں انقلاب محض تبدیلی کے عمل کا نام نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تبدیلی و تغیر تو وقت اپنے آپ کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس تبدیلی میں وہ انسانی فکر اور عمل کی بااِرادہ اور باشعور شمولیت چاہتے ہیں۔ جوش کا انقلاب انفعالی یا صرف قولی نوعیّت کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا فاعلی تجربہ ہے جس میں انسان کا ذہن اور اس کا وجود مکمل یگانگت کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ انقلاب جوش کے یہاں اپنی اصل سے انحراف کا نام نہیں ہے بلکہ وہ داعیہ ہے جو انسان کے باطن میں پیدا ہی اُس وقت ہوتا ہے جب یہ احساس زور پکڑتا ہے کہ فطرتِ انسانی کا قوام بگڑ گیا ہے اور وہ اپنی اصل سے منحرف ہو گئی ہے۔ تو انقلاب کا یہ آوازہ حقیقت میں انسانی روح کی پکار ہے جب وہ اپنی اصل کی جستجو کرتی ہے، سچائی، آزادی اور خیر کے لیے۔

یہ درست ہے کہ جوش جب انقلاب کا آوازہ بلند کرتے ہیں تو اُس میں فرنگی استعمار سے بغاوت صاف دیکھی جا سکتی ہے، اس کا اظہار ان کے یہاں الفاظ کے استعمال اور موضوع کے انتخاب دونوں ہی صورتوں میں نظر آتا ہے لیکن یہ ان کے انقلابی جذبات کا ابتدائی مرحلہ ہے جو آگے چل کر حق کے اُس تصوّر سے مربوط ہو جاتا ہے جو فرد کو استعمار و استحصال کی ہر قوت سے ٹکرانے کی جرأت عطا کرتا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہٹلر کو یورپی سامراج سے ٹکرانے پر خراج پیش کرنے والے شاعر (۶) کے لیے اب ایسی مثالیں توجہ کی طالب نہیں رہتیں اور اُس کی نظر اس اعلیٰ و ارفع نمونے پر مرکوز ہو جاتی ہے جس نے محض سیاسی تبدیلی یا بغاوت کی وجہ سے نہیں بلکہ صلابتِ کردار اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جرأتِ انکار کو انسانیت کی معراج بنا دیا۔

تب شاعر کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کو غلامانِ روسیاہ کہنے اور ابنائے وطن کی دُہائی دینے والے شاعر کا طرزِ تخاطب بھی اب بدلتا ہے۔ طنز و تشنیع کا عنصر بیان میں بالکل ہی دوسری صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اب طنز کا یہ عمل استہزا اور تضحیک کے لیے نہیں بلکہ ایک رنج کا اظہار بن جاتا ہے اور اس میں ملال، غم گساری اور دردمندی کا احساس فزوں ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر جوش کی روشن خیالی، سیکولرزم اور دہریت کوئی چیز اُن کے کام نہیں آتی۔ جدید مغربی افکار سے ماخوذ تصوّرِ انسان بھی یہاں بے کارِ محض ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں شاعر کو گوشت پوست کے انسان کے خالص تجربے کی ضرورت پڑتی ہے جس میں کوئی کھوٹ نہ ہو اور جو اپنے جذبے کو اُن اعلیٰ ترین اقدار سے آمیز کرتا ہو جو انسانیت کی معراج قرار پاتی ہیں۔ اب یہ اتنا بڑا مطالبہ ہے کہ جس کا بارِ گراں روشن خیالی، سیکولرزم، انسان پرستی، قوتِ حیات اور دہریت وغیرہم میں کسی سے اٹھائے نہیں اٹھتا، بلکہ ان سب سے مل کر بھی نہیں اٹھتا۔ یہاں جوش کی نگاہیں اپنی اصل کی طرف پلٹتی ہیں۔ چنانچہ وہ آدمی جو کہتا تھا:

گھٹتے گھٹتے مہرِ عالم تاب سے تارہ ہوا
آدمی ہے مذہب و تہذیب کا مارا ہوا

حقّا کہ صاحبانِ روایت کے دین سے
پاکیزہ تر ہیں اہلِ درایت کے کفریات

اب گہرے اضطراب مگر پوری دردمندی کے ساتھ اپنی اصل کی طرف پلٹتا ہے تو اُن حوالوں اور مثالوں سے رجوع کرتا ہے جو انسانی فکر و احساس کی بالکل ایک دوسری دنیا ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ موازنے کی مثال سطورِ گذشتہ میں دی جا چکی، لیجیے اب تطبیق کا انداز دیکھیے:

حق نے تم کو نوعِ انساں کا بنایا تھا امام
بن گئے تم لعنتِ کوتاہ بینی سے غلام
جب یہ عالم ہے تو وابستہ رہو اصنام سے
تم کو پھر کیا واسطہ پیغمبرِ اسلام سے

وہ اپنے لوگوں کو بتاتا ہے کہ:

پھر نائبِ یزید ہیں دُنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دو چار

آپ نے دیکھا کہ لہجہ بدلا، تشبیہ، تلمیح، استعارہ بدلا — اور پھر بات کی پوری نوعیت ہی بدل گئی۔ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ شخص جس کی شہرت میں اُس کی دہریت ایک مستقل عنوان کا درجہ رکھتی ہے، وہ کن حوالوں اور مثالوں سے بات کر رہا ہے۔ دیکھیے یہ مصرعے جوش کی انقلاب پسندی کی معنویت کو کیا رُخ دے رہے ہیں۔ یہاں ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ جوش کے تصوّرِ انقلاب میں جوہری تبدیلی پیدا ہوئی اور یہ تبدیلی پیغمبرِ اسلام سے وابستگی اور کربلا کا حوالہ جب پیش کرتی ہے تو اس کا مقصود صرف اور صرف کسی خاص سیاسی نظام یا مخصوص جغرافیائی حدود میں ردّ و بدل نہیں رہتا بلکہ پھر اس کے پیشِ نظر سوال پوری انسانیت کا اور نوعِ بشر کا ہوتا ہے۔ اور یہاں انقلاب شر کے استرداد اور خیر کو

پانے کا عمل بن جاتا ہے۔ تو بس یہی وہ تبدیلی ہے جو ترقی پسندوں کی نعرہ باز انقلابیت سے جوش کو الگ کرتی ہے اور اُن کے تصوّرِ انقلاب کو تہذیبی و اخلاقی بنیادوں پر استوار کر کے ایک مختلف مقام دلاتی ہے۔

حوالہ جات

* مبین مرزا، مینیجنگ ڈائریکٹر، اکادمی بازیافت، کراچی۔

(۱) عزیز حامد مدنی، جدید اردو شاعری، جلد دوم (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء)۔

(۲) جوش کی شاعری کے ان اساسی تصورات کی بحث ہم جوش پر اپنے ایک اور مضمون میں کر چکے ہیں۔ دیکھیے: مبین مرزا، ''چاکِ داماں پہ نثار'' نجوم و جواہر، جوش ملیح آبادی (کیلگری: جوش لٹریری سوسائٹی آف کینیڈا، ۲۰۰۸ء)، ۳۰۴-۲۵۸۔

(۳) یہاں حوالہ جرمن فلسفی Nietzsche کا ہے، جنھوں نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب *Thus Spoke Zarathustra* میں Superman کا نظریہ وضع کیا۔

(۴) سلیم احمد، مضامین سلیم احمد، ترتیب جمال پانی پتی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۹ء)۔

(۵) دیکھیے حوالہ نمبر (۱)۔

(۶) یہاں حوالہ نظم ''ہٹلرِ اعظم'' کا ہے جو اکثر جوش سے منسوب کی جاتی ہے، مگر اس بات پر صدفی صد اتفاقِ رائے نہیں ہے کہ یہ جوش کی ہی لکھی ہوئی ہے۔

کتابیات

احمد، سلیم۔ مضامین سلیم احمد۔ ترتیب جمال پانی پتی۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۹ء۔

مدنی، عزیز حامد۔ جدید اردو شاعری۔ جلد دوم۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء۔

مرزا، مبین۔ ''چاکِ داماں پہ نثار'' نجوم و جواہر، جوش ملیح آبادی۔ کیلگری: جوش لٹریری سوسائٹی آف کینیڈا، ۲۰۰۸ء۔ ۳۰۴-۲۵۸۔